

تلخیص

تَفْهِيْمُ الْوَقْتِ

ترجمہ و تفسیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تلخیص

مولانا صدر الدین اصلاحی

الحجر

نام

آیت ۸۰ کے فقرے كَذَّبَ اصْحَابُ الْحَجْرِ الْمُرْسَلِينَ سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول

مضامین اور انداز بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس سورے کا زمانہ نزول سورۃ ابراہیم سے متصل ہے۔ اس کے پس منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی ﷺ کو دعوت دینے ایک مدت گزر چکی ہے اور مخاطب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزاء، مزاحمت اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی ہے، جس کے بعد اب تفہیم کا موقع کم اور تنبیہ و انذار کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و جود اور مزاحمت کے پہاڑ توڑتے توڑتے نبی ﷺ تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپ پر طاری ہو رہی ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہا ہے اور آپ کی ہمت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون

یہی دو مضمون اس سورے میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ اُن لوگوں کو جو نبی ﷺ کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے۔ اور تسلی و ہمت افزائی آنحضرت ﷺ کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورۃ تفہیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مجرد تنبیہ، یا خالص زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور ملا متوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورے میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اور دوسری طرف قصہ آدم و ابلیس سنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

﴿۱۵﴾ سُوْرَةُ الْحَجْرِ الْمَكِّيَّةُ ﴿۱۵۲﴾ ﴿رُكُوْعَاتُهَا ۶﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّفِ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ①
 رَبَّمَا یُوْدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ②
 ذُرِّهْمُ یَاكُفُوْا وَیَتَّبِعُوْا وَیُلٰهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ③
 وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ ④
 تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاخِرُوْنَ ⑤ وَقَالُوْا یٰاٰیٰتُهَا

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

۱، ر۔ یہ آیات ہیں کتاب الہی اور قرآن مسبین کی [۱]

بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے، پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑ و انھیں۔ کھائیں پیئیں، مزے کریں، اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی [۲] کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اُس کے بعد چھوٹ سکتی ہے۔

[۱] یہ اس سورہ کی مختصر تعارفی تمہید ہے جس کے بعد فوراً ہی اصل موضوع پر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن کے لیے ”مبین“ کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اُس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ کفر کرتے ہی فوراً تو ہم نے کبھی کسی قوم کو بھی نہیں پکڑ لیا ہے، پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب و استہزاء کی جو روش انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اُس پر چونکہ ابھی تک انہیں سزا نہیں دی گئی، اس لیے یہ نبی سرے سے نبی ہی نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے لیے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنہلنے کے لیے اتنی مہلت دی جائے گی، اور اس حد تک اُس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے اور ہماری مقرر کی ہوئی حد جس وقت تک آ نہیں جاتی ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ (مہلت عمل کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم، حاشیہ ۱۸)

الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرَ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿٤﴾ لَوْ مَا تَأْتِينَا
بِالْبَلَايَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥﴾ مَا نُنزِّلُ الْبَلَايَةَ
إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنتَظِرِيْنَ ﴿٦﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ﴿٧﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
فِي شِيْعِ الْأَوَّلِيْنَ ﴿٨﴾ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا

یہ لوگ کہتے ہیں ”اے وہ شخص جس پر یہ ذکر [۳] نازل ہوا ہے، [۴] تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟“ ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی [۵]۔ ہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں [۶]۔ اے نبی، ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں

[۳] ”ذکر“ کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلام الہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے۔ پہلے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی ”ذکر“ تھیں اور یہ قرآن بھی ”ذکر“ ہے۔ ذکر کے اصل معنی ہیں ”یاد دلانا“، ”ہوشیار کرنا“، اور ”نصیحت کرنا۔“
[۴] یہ فقرہ وہ لوگ طفر کے طور پر کہتے تھے۔ ان کو تو یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ یہ ذکر نبی ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ نہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے۔ دراصل ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ”اے وہ شخص جس کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے۔“ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں سے کہی تھی کہ اِنَّ رَّسُوْلَکُمْ الَّذِیْ اَرْسَلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵﴾ یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، ان کا دماغ درست نہیں ہے۔“

[۵] یعنی فرشتے محض تماشا دکھانے کے لیے نہیں اتارے جاتے کہ جب کسی قوم نے کہا بلاؤ فرشتوں کو اور وہ فوراً حاضر ہوئے۔ نہ فرشتے اس غرض کے لیے کبھی بھیجے جاتے ہیں کہ وہ آکر لوگوں کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کریں اور پردہ غیب کو چاک کر کے وہ سب کچھ دکھادیں جس پر ایمان لانے کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ فرشتوں کو بھیجنے کا وقت تو وہ آخری وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اُس وقت بس فیصلہ چکا یا جاتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ اب ایمان لاؤ تو چھوڑ دیتے ہیں۔ ایمان لانے کی جتنی مہلت بھی ہے اسی وقت تک ہے جب تک کہ حقیقت بے نقاب نہیں ہو جاتی۔ اُس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد ایمان لانے کا کیا سوال۔ ”حق کے ساتھ اترتے ہیں“ کا مطلب ”حق لے کر اترنا“ ہے۔ یعنی وہ اس لیے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ یاد دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا برحق فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

[۶] یعنی یہ ”ذکر“ جس کے لانے والے کو تم مجنون کہہ رہے ہو، یہ ہمارا نازل کیا ہوا ہے، اس نے خود نہیں گھڑا ہے۔ اس لیے یہ گالی اس کو نہیں ہمیں دی گئی ہے۔ اور یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو کہ تم اس ”ذکر“ کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ یہ براہ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمہارے مٹائے مٹ سکا، نہ تمہارے دبائے دب سکا، نہ تمہارے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکی، نہ تمہارے روکے اس کی دعوت رُک سکی، نہ اس میں تحریف اور رد و بدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکا۔

بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۱۱﴾ كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۲﴾
لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳﴾ وَكُوَفَّتْحَنَا
عَلَيْهِمْ بِآبَاءِ مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا
سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ جَعَلْنَا
فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ

نے اُس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (ہملاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے [۴]۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم اُن پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دھاڑے اُس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے، اُن کو دیکھنے والوں کے لیے (ستاروں سے) آراستہ [۹] کیا، اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا [۱۰]۔

[۴] عام طور پر مترجمین و مفسرین نے نَسْلُكُهُ کی ضمیر استہزاء کی طرف، اور لَا يُؤْمِنُونَ پہ کی ضمیر ذکر کی طرف پھیری ہے۔ اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”ہم اسی طرح اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اس ذکر پر ایمان نہیں لاتے۔“ اگرچہ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک نحو کے اعتبار سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ضمیریں ذکر کی طرف پھیری جائیں۔

سَلْكَ کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانا، گزارنے اور پروانے کے ہیں، جیسے تاگے کو سوئی کے ناکے میں گزارنا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شتابہ بن کر لگتا ہے اور اُن کے اندر اسے سن کر ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے گویا کہ ایک گرم ہتھیار تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

[۸] اصل میں لفظ بروج استعمال ہوا ہے۔ بروج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علم ہیئت میں ”برج“ کا لفظ اصطلاحاً اُن بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لیے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضا کے بیسٹ میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ نقطوں (Fortified Spheres) کے معنی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

[۹] یعنی ہر خطے میں کوئی نہ کوئی روشن سیارہ یا تارار رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا۔ بالفاظ دیگر ہم نے اس نا پیداکنار کائنات کو ایک بھیا تک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے

رَجِيمٍ ﴿۱۴﴾ إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ مَبِينٌ ﴿۱۵﴾

کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پاسکتا، الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے [۱۱] اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اُس کا پیچھا کرتا ہے۔ [۱۲]

جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا ریگری میں صرف ایک صالح اکبر کی صنعت اور ایک حکیم اجل کی حکمت ہی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ یہی مضمون ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے، اَلَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (سجدہ: ۷) ”وہ خدا کہ جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی۔“

[۱۰] یعنی جس طرح زمین کی دوسری مخلوقات زمین کے خطے میں مقید ہیں اسی طرح شیاطین جن بھی اسی خطے میں مقید ہیں، عالم بالاتک اُن کی رسائی نہیں ہے۔ اس سے دراصل لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو دور کرنا مقصود ہے جس میں پہلے بھی عوام الناس بتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذریت کے لیے ساری کائنات کھلی پڑی ہے، جہاں تک وہ چاہیں پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ شیاطین ایک خاص حد سے آگے نہیں جاسکتے، انھیں غیر محدود پرواز کی طاقت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔

[۱۱] یعنی وہ شیاطین جو اپنے اولیاء کو غیب کی خبریں لاکر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بہت سے کابن، جوگی، عامل اور فقیر نما بہرہ و پیسے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں، اُن کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔ وہ کچھ سن گن لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کیونکہ اُن کی ساخت انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع اُن کے پلے کچھ پڑتا نہیں ہے۔

[۱۲] ”شہاب مبین“ کے لغوی معنی ”شعلہ روشن“ کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لیے ”شہاب ثاقب“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ”تار کی کو چھیدنے والا شعلہ“۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارہ ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہاب ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں، مثلاً کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانہ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دور بین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضا بے بیض سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، اُن کی تعداد کا اوسط دس کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکینڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سکینڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۱۹۳۶ء جلد ۱۵: ص ۳۹ و ۳۳) ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالائی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضا بے بیض میں دس کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات اُن کے لیے اس فضا کو بالکل ناقابل عبور بنا دیتی ہوگی۔

اس سے کچھ اُن ”مخفوظ قلعوں“ کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بہ ظاہر فضا بالکل صاف شفاف ہے، جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت بنی نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ مَّوْرُؤِينَ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ
لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿۲۰﴾ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خِزْيَانُهُ نَوْمَانِزْلُهُ
إِلَّا يَبْقَدِرُ مَعْلُومٍ ﴿۲۱﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنْ

ہم نے زمین کو پھیلا یا، اُس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ
اگائی،^[۱۳] اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے، تمہارے لیے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے
رازق تم نہیں ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے
ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں۔^[۱۴] بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں،

جو ایک خطے کو دوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط
سے زمین کی طرف گرتے ہیں وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں
(Meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں ان میں سب سے بڑا ۶۳۵۱ پونڈ کا ایک پتھر ہے
جو گر کر اٹلیٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی
کوئی توجیہ سائنس داں اس کے سوانہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجئے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط
حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے
”بروج“ (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

[۱۳] اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع میں تناسل کی
اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع مل جاتا تو چند سال کے اندر روئے
زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کے لیے کوئی جگہ نہ رہتی۔ مگر یہ ایک حکیم اور قادر مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس
کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اس زمین پر آگ رہی ہیں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر رُک جاتی ہے۔
اسی منظر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہر نوع کی جسامت، پھیلاؤ، اٹھان اور نشوونما کی ایک حد مقرر ہے جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز
نہیں کر سکتی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہر درخت، ہر پودے اور ہر تیل بوٹے کے لیے جسم، قد، شکل، برگ و بار اور پیداوار کی ایک
مقدار پورے ناپ تول اور حساب و شمار کے ساتھ مقرر کر رکھی ہے۔

[۱۴] یہاں اس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام موجودات کے معاملہ میں
عام ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر جنس، اور ہر قوت و طاقت کے لیے ایک حد
مقرر ہے جس پر وہ ٹھہری ہوئی ہے اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ اسی تقدیر اور کمال درجہ کی حکیمانہ تقدیر ہی
کا یہ کرشمہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک پورے نظام کائنات میں یہ توازن، یہ اعتدال، اور یہ تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات

السَّمَاءِ مَاءً فَاسْقَيْنَكُمْوَهُوَ مَا أَنْتُمْ لَهُ بِخٰزِنِينَ ﴿۲۲﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ
نَحْيُ وَنُبِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُونَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ
مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتٰخِرِينَ ﴿۲۴﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ
يَخْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ
مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَبَآءٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ

اور اُس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔ زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں۔^[۱۵] پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں اُن کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔^[۱۶] ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔^[۱۷] اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپٹ

ایک اتفاقی حادثہ ہوتی، یا بہت سے خداؤں کی کاریگری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بے شمار مختلف اشیاء اور قوتوں کے درمیان ایسا مکمل توازن و تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہ سکتا؟

[۱۵] یعنی تمہارے بعد ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی ملا ہوا ہے محض عارضی استعمال کے لیے ملا ہوا ہے۔ آخر کار ہماری دی ہوئی ہر چیز کو یونہی چھوڑ کر تم خالی ہاتھ رخصت ہو جاؤ گے اور یہ سب چیزیں جنوں کی توں ہمارے خزانے میں رہ جائیں گی۔

[۱۶] یعنی اُس کی حکمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ سب کو اکٹھا کرے اور اس کا علم سب پر اس طرح حاوی ہے کہ کوئی تنفس اُس سے چھوٹ نہیں سکتا، بلکہ کسی اگلے پچھلے انسان کی خاک کا کوئی ذرہ بھی اُس سے گم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو شخص حیاتِ اخروی کو مستعد سمجھتا ہے وہ خدا کی صفتِ حکمت سے بے خبر ہے، اور جو شخص حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ ”جب مرنے کے بعد ہماری خاک کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا تو ہم کیسے دوبارہ پیدا کیے جائیں گے“ وہ خدا کی صفتِ علم کو نہیں جانتا۔

[۱۷] یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دور کے ڈاروینیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اُس کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَبَآءٍ مَّسْنُونٍ کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ حَمًا عربی زبان میں ایسی سیاہ کچھڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بو پیدا ہو چکی ہو، یا بالفاظِ دیگر خمیر اٹھا آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی ہیں قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اُس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔

مِنْ تَارِ السَّمُومِ ﴿۱۷﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا
مِّنْ صَلٰصَالٍ مِّنْ حَبٍ اَمْسُوْنِ ﴿۱۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ
مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ كُلُّهُمْ
اَجْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ اِلَّا اِبْلِيْسَ اَبٰى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السَّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱﴾
قَالَ يَا اِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السَّٰجِدِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ لَمَّا كُنْتُ

سے پیدا کر چکے تھے۔^[۱۸] پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ ”میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں^[۱۹] تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔^[۲۰] ”رب نے پوچھا“ اے ابلیس، تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟“ اس نے کہا ”میرا

[۱۸] سَمُوم گرم ہوا کو کہتے ہیں، اور نارا کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اُس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اُن مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔
[۱۹] اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفات الہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار، اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کا لبد خدا کی پر ڈالا گیا ہے، اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجودات ارضی کا موجود قرار پایا ہے۔
یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے، اس کا مصدر منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَ تِسْعِيْنَ وَاَنْزَلَ فِي الْاَرْضِ جُزْءًا وَاَحَدًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ يَتَرَا حَمَّ الْخَلٰئِقِ حَتّٰى تَرْفَعُ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَّلَدِهَا خَشِيَةً اَنْ تُصِيبَهُ (بخاری و مسلم)۔ ”اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اسی حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا گھر اٹھاتا ہے تاکہ اُسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اسی حصہ رحمت کا اثر ہے۔“ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کو جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفات الہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جز پالینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراہ اور اہ ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پاسکے۔

[۲۰] تقابل کے لیے سورہ بقرہ رکوع ۴۔ سورہ نساء رکوع ۱۸، اور سورہ اعراف رکوع ۲ پیش نظر رہے۔ نیز ہمارے اُن حواشی پر

بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو ان مقامات پر لکھے گئے ہیں۔

لَا سَجْدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَبَآءٍ مَّسْنُونٍ ﴿۳۲﴾
 قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿۳۳﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ
 إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۳۵﴾
 قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿۳۶﴾ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۳۷﴾
 قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ
 وَلَا أُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۸﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْبَاطِلِينَ ﴿۳۹﴾
 قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۰﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ
 لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۴۱﴾

یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔“ رب نے فرمایا ”اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے، اور اب روز جزا تک تجھ پر لعنت ہے،“ [۳۲] اُس نے عرض کیا ”میرے رب، یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس روز تک کے لیے مہلت دے جب کہ سب انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا ”اچھا، تجھے مہلت ہے اُس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔“ وہ بولا ”میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکادوں گا،“ [۳۳] سوائے تیرے اُن بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔“ فرمایا ”یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔“ [۳۴] بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف اُن بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں، [۳۵]

[۲۱] یعنی قیامت تک تو ملعون رہے گا، اس کے بعد جب روز جزا قائم ہوگا تو پھر تجھے تیری نافرمانیوں کی سزا دی جائے گی۔
 [۲۲] یعنی جس طرح تو نے اس حقیر اور کم تر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا کہ تیرا حکم نہ مانوں، اسی طرح اب میں ان انسانوں کے لیے دنیا کو ایسا دل فریب بنا دوں گا کہ یہ سب اُس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔ بالفاظ دیگر ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں زمین کی زندگی اور اُس کی لذتوں اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسان کے لیے ایسا خوش نما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمے داریوں اور آخرت کی باز پرس کو بھول جائیں گے اور خود تجھے بھی یا تو فراموش کر دیں گے، یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

[۲۳] هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی وہ ہیں جو ہم نے ترجمہ میں بیان کیے ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ هَذَا طَرِيقٌ حَقٌّ عَلَيَّ اَنْ اُرَاعِيهِ یعنی یہ بات درست ہے، میں بھی اس کا پابند ہوں گا۔

[۲۴] اس فقرے کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں

وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ

اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ [۲۵]

یہ جہنم (جس کی وعید پیروان ابلیس کے لیے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں۔

(عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انہیں زبردستی نافرمان بنا دے، البتہ جو خود ہی بیکے ہوئے ہوں اور آپ ہی تیری پیروی کرنا چاہیں انہیں تیری راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا، انہیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، جو لوگ اس راستے کو اختیار کر لیں گے ان پر شیطان کا بس نہ چلے گا، انہیں اللہ اپنے لیے خالص فرمائے گا اور شیطان خود بھی اقرار ہی ہے کہ وہ اُس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہو کر اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کر دیں گے وہ ابلیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے اور پھر جہد جہد وہ انہیں فریب دے کر لے جانا چاہے گا، وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دور سے دور تک نکلنے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا: شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لیے اپنا طریق کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو اُن کے لیے خوش نما بنا کر انہیں خدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شرط میں نے مانی، اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جا رہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جا رہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے اُن بندوں کو مستثنیٰ کیا جنہیں اللہ اپنے لیے خالص فرمائے۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یوں ہی جس کو چاہے گا خالص کر لے گا اور وہ شیطان کی دست رس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہوگا وہی تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظ دیگر جو بہکا ہوا نہ ہوگا وہ تیری پیروی نہ کرے گا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہوگا جسے ہم خالص اپنا کر لیں گے۔

[۲۵] اس جگہ یہ قصہ جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاق و سباق کو واضح طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ پہلے اور دوسرے رکوع کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سلسلہ بیان میں آدم و ابلیس کا یہ قصہ بیان کرنے سے مقصود کفار کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ تم اپنے ازلی دشمن، شیطان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور اُس پستی میں گرے چلے جا رہے ہو جس میں وہ اپنے حسد کی بنا پر تمہیں گرا نا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نبی تمہیں اُس کے پھندے سے نکال کر اُس بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے جو دراصل انسان ہونے کی حیثیت سے تمہارا فطری مقام ہے۔ لیکن تم عجیب احمق لوگ ہو کہ اپنے دشمن کو دوست، اور اپنے خیر خواہ کو دشمن سمجھ رہے ہو۔

اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اسی قصہ سے اُن پر واضح کی گئی ہے کہ تمہارے لیے راہ نجات صرف ایک ہے، اور وہ اللہ کی بندگی ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر تم جس راہ پر بھی جاؤ گے وہ شیطان کی راہ ہے جو سیدھی جہنم کی طرف جاتی ہے۔

تیسری بات جو اس قصے کے ذریعہ سے ان کو سمجھائی گئی ہے، یہ ہے کہ اپنی اس غلطی کے ذمہ دار تم خود ہو۔ شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا سے تم کو دھوکا دے کر تمہیں بندگی کی راہ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا نفعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہاری اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔ (اس کی مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم، آیت ۲۲ و حاشیہ ۳۱)

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ﴿۳۳﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۳۴﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غَلٍ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ ﴿۳۶﴾ لَا يَسْهَمُوْنَ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۳۷﴾ نَبِيٌّ عِبَادِيْ اَنِيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۸﴾ وَاَنَّ عَدَاۤىِيْ

ہر دروازے کے لیے اُن میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے ع [۲۶] بخلاف اس کے متقی لوگ [۲۷] باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔ اُن کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے، [۲۸] وہ آپس میں بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انھیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ [۲۹]

اے نبی، میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں۔ مگر اس کے ساتھ میرا عذاب

[۲۶] جہنم کے یہ دروازے اُن گمراہیوں اور معصیوں کے لحاظ سے ہیں جن پر چل کر آدمی اپنے لیے دوزخ کی راہ کھولتا ہے۔ مثلاً کوئی دہریت کے راستے سے دوزخ کی طرف جاتا ہے، کوئی شرک کے راستے سے، کوئی نفاق کے راستے سے، کوئی نفس پرستی اور فتنہ و فجور کے راستے سے، کوئی ظلم و ستم اور خلق آزاری کے راستے سے، کوئی تبلیغ ضلالت اور اقامت کفر کے راستے سے، اور کوئی اشاعت فحشاء و منکر کے راستے سے۔ {جس شخص کا جو وصف زیادہ نمایاں ہوگا اسی کے لحاظ سے جہنم کی طرف جانے کے لیے اس کا راستہ متعین ہوگا}۔

[۲۷] یعنی وہ لوگ جو شیطان کی پیروی سے بچے رہے ہوں اور جنھوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے عبدیت کی زندگی بسر کی ہو۔ [۲۸] یعنی نیک لوگوں کے درمیان آپس کی غلط فہمیوں کی بنا پر دنیا میں اگر کچھ کدورتیں پیدا ہوگی ہوں گی تو جنت میں داخل ہونے کے وقت وہ دور ہو جائیں گی اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف کر دیے جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف، حاشیہ ۳۲)

[۲۹] اس کی تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور نے خبر دی ہے کہ يقال لاهل الجنة ان لكم ان تصحوا ولا تمرضوا ابدًا، وان لكم ان تعيشوا فلا تموتوا ابدًا، وان لكم ان تشبوا ولا تهرموا ابدًا، وان لكم ان تقيموا فلا تظعنوا ابدًا۔ یعنی ”اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے، کبھی بیمار نہ پڑو گے۔ اور اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی۔ اور اب تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی بڑھا پاتا تم پر نہ آئے گا۔ اور اب تم ہمیشہ مقیم رہو گے، کبھی کوچ کرنے کی تمہیں ضرورت نہ ہوگی۔“ اس کی مزید تشریح اُن آیات و احادیث سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو اپنی معاش اور اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے کوئی محنت نہ کرنی پڑے گی، سب کچھ اُسے بلا سعی و مشقت ملے گا۔

هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾ وَنَبِّئَهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿۵۱﴾
 إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجَلُونَ ﴿۵۲﴾
 قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلْمٍ عَلَيْمِ ﴿۵۳﴾ قَالَ أَبَشْرْتُمُونِي
 عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فِيمِ الْبَشْرُونَ ﴿۵۴﴾ قَالُوا بَشْرْنَاكَ
 بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقٰنِطِينَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ
 رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾

بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔

اور انھیں ذرا ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔^[۳۰] جب وہ آئے اُس کے ہاں اور کہا ”سلام ہو تم پر“، تو اُس نے کہا ”ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے“،^[۳۱] انہوں نے جواب دیا ”ڈرو نہیں، ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں“،^[۳۲] ابراہیم نے کہا ”کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا ”ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو“۔ ابراہیم نے کہا ”اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔“ پھر ابراہیم نے پوچھا ”اے فرستادگان الہی، وہ ہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟“^[۳۳]

[۳۰] یہاں حضرت ابراہیم اور ان کے بعد مصلوٰ قوم لوط کا قصہ جس غرض کے لیے سنایا جا رہا ہے اُس کو سمجھنے کے لیے اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ آیات ۷، ۸ میں کفار مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ نبی ﷺ سے کہتے تھے کہ ”اگر تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے؟“ اس کا مختصر جواب وہاں صرف اس قدر دے کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ ”فرشتوں کو ہم یونہی نہیں اتار دیا کرتے، انہیں تو ہم جب بھیجتے ہیں حق کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں۔“ اب اُس کا مفصل جواب یہاں ان دونوں قصوں کے پیرائے میں دیا جا رہا ہے۔ یہاں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک ”حق“ تو وہ ہے جسے لے کر فرشتے ابراہیم کے پاس آئے تھے، اور دوسرا حق وہ ہے جسے لے کر وہ قوم لوط پر پہنچے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تمہارے پاس ان میں سے کون سا حق لے کر فرشتے آسکتے ہیں۔ ابراہیم والے حق کے لائق تو ظاہر ہے کہ تم نہیں ہو۔ اب کیا اُس حق کے ساتھ فرشتوں کو بلوانا چاہتے ہو جسے لے کر وہ قوم لوط کے ہاں نازل ہوئے تھے؟

[۳۱] تقابلی کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ ہود، رکوع ۷ مع حواشی۔

[۳۲] یعنی حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت، جیسا کہ سورۃ ہود میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

[۳۳] حضرت ابراہیم کے اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا ہمیشہ غیر معمولی حالات ہی میں ہوا کرتا ہے اور کوئی بڑی مہم ہی ہوتی ہے جس پر وہ بھیجے جاتے ہیں۔

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا لَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۶۰﴾
فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ ﴿۶۲﴾
قَالُوا بَلْ جُنْدِكَ بِمَا كَانَ نُوَا فِيهِ يَسْتُرُونَ ﴿۶۳﴾ وَآتَيْنَكَ
بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۶۴﴾ فَاسْرِبْ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ
وَاصْبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ

وہ بولے، ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ [۳۴] صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں، ان سب کو ہم بچالیں گے، سوائے اُس کی بیوی کے جس کے لیے (اللہ فرماتا ہے کہ) ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔“
پھر جب یہ فرستادے لوط کے ہاں پہنچے [۳۵] تو اُس نے کہا ”آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔“ [۳۶] انہوں نے جواب دیا، ”نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں۔ لہذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔“ [۳۷] تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ [۳۸] بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں

[۳۴] اشارے کا یہ اختصار صاف بتا رہا ہے کہ قوم لوط کے جرائم کا پیمانہ اس وقت اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیم جیسے باخبر آدمی کے سامنے اس کا نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، بس ”ایک مجرم قوم“ کہہ دینا بالکل کافی تھا۔

[۳۵] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف، رکوع ۱۰ اور سورہ ہود، رکوع ۷۔

[۳۶] یہاں بات مختصر بیان کی گئی ہے۔ سورہ ہود میں اس کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے آنے سے حضرت لوط بہت گھبرائے اور سخت دل تنگ ہوئے اور ان کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کہنے لگے کہ آج بڑا سخت وقت آیا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ جو قرآن کے بیان سے اشارتاً اور روایات سے صراحتاً معلوم ہوتی ہے، یہ تھی کہ یہ فرشتے نہایت خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط کے ہاں پہنچے تھے۔ اور حضرت لوط اپنی قوم کی بد معاشی سے واقف تھے، اس لیے آپ سخت پریشان ہوئے کہ آئے ہوئے مہمانوں کو واپس بھی نہیں کیا جاسکتا، اور انہیں ان بد معاشوں سے بچانا بھی مشکل ہے۔

[۳۷] یعنی اس غرض سے اپنے گھر والوں کے پیچھے چلو کہ ان میں سے کوئی ٹھیرنے نہ پائے۔

[۳۸] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو جاؤ گے، جیسا کہ بائبل میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشادیکھنے کے لیے نہ ٹھیر جانا۔ یہ نہ تماشادیکھنے کا وقت ہے، اور نہ مجرم قوم کی ہلاکت پر آنسو بہانے کا۔ ایک لمحہ بھی اگر تم نے معذب قوم کے علاقے میں دم لے لیا تو بعد نہیں کہ تمہیں بھی اس ہلاکت کی بارش سے کچھ گزند پہنچ جائے۔

تُوْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هُوْلَاءِ مَقْطُوعٌ
مُّصْبِحِينَ ﴿۶۶﴾ وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾ قَالَ إِنَّ
هُوْلَاءِ صِيفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزَوْنَ ﴿۶۹﴾
قَالُوا أَوْلَٰكُم نَهْكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هُوْلَاءِ بَنَاتِي إِنْ
كُنْتُمْ فَعَالِينَ ﴿۷۱﴾ لَعْنَةُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۲﴾

حکم دیا جا رہا ہے۔“ اور اُسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوٹ کے گھر چڑھ آئے۔^[۳۹] لوٹ نے کہا ”بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو۔“ وہ بولے ”کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟“ لوٹ نے عاجز ہو کر کہا ”اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں!“^[۴۰] تیری جان کی قسم اے نبی، اُس وقت اُن پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپ سے باہر ہوئے جاتے تھے۔

[۳۹] اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوب صورت مہمانوں کا آجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ اُس کے گھر پر ادا باشوں کا ایک جھوم امنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ اُن کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اٹھاتا، اور نہ اُن کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوٹ جیسے مقدس انسان اور معلم اخلاق کے گھر پر بھی جب بد معاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔

[۴۰] اس کی تشریح سورہ ہود کے حاشیہ ۸۷ میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ کلمات ایک شریف آدمی کی زبان پر ایسے وقت میں آئے ہیں جب کہ وہ بالکل تنگ آچکا تھا اور بد معاش لوگ اس کی ساری فریاد و نغاں سے بے پروا ہو کر اُس کے مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اس موقع پر ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ سورہ ہود میں واقعہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے اُس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت لوٹ کو بد معاشوں کے اس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ وہ اُس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ چند مسافر لڑکے ہیں جو ان کے ہاں آ کر ٹھہرے ہیں۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کی حقیقت اُس وقت کھولی جب بد معاشوں کا جھوم مہمانوں کی قیام گاہ پر پل پڑا اور حضرت لوٹ نے تڑپ کر فرمایا: لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أُوَادِّجِي إِلَىٰ رُسُلِي شَدِيدِهِ ”کاش مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت حاصل ہوتی یا میرا کوئی سہارا ہوتا جس سے میں حمایت حاصل کرتا۔“ اس کے بعد فرشتوں نے اُن سے کہا کہ اب تم اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دو۔ واقعات کی اس ترتیب کو نگاہ میں رکھنے سے

فَاخَذَتْهُمْ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ﴿۴۳﴾ فَجَعَلْنَا عَلَيْهَا سَافِلَهَا
 وَامْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ ﴿۴۴﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ
 لِلْمُتَوَسِّبِينَ ﴿۴۵﴾ وَإِنَّهَا لِبَسْبِيلٍ مُقِيمٍ ﴿۴۶﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً
 لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۷﴾ وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۴۸﴾
 فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهَا لِبِأَمَامٍ مُبِينٍ ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ

آخر کار پو پھٹتے ہی اُن کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اُس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔^[۴۱]

اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو صاحب فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزرگاہ عام پر واقع ہے،^[۴۲] اُس میں سامان عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ہیں۔ اور ایکہ^[۴۳] والے ظالم تھے، تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی اُن سے انتقام لیا، اور ان دونوں قوموں کے اجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔^[۴۴]

پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے یہ الفاظ کس تنگ موقع پر عاجز آ کر فرمائے تھے۔ اس سورے میں چونکہ واقعات کو اُن کی ترتیب وقوع کے لحاظ سے نہیں بیان کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس خاص پہلو کو خاص طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے جسے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہی یہ قصہ یہاں نقل کیا گیا ہے، اس لیے ایک عام ناظر کو یہاں یہ غلط فہمی پیش آتی ہے کہ فرشتے ابتدا ہی میں اپنا تعارف حضرت لوطؑ سے کرا چکے تھے اور اب اپنے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے اُن کی یہ ساری فریاد و فغاں محض ایک ڈرامائی انداز کی تھی۔

[۴۱] یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہاب ثاقب کی نوعیت کے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار (Volcanic Eruption) کی بدولت زمین سے نکل کر اُڑے ہوں اور پھر اُن پر بارش کی طرح برس گئے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سخت آندھی نے یہ پتھراؤ کیا ہو۔ [۴۲] یعنی حجاز سے شام، اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحر لوط (بحیرہ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

[۴۳] یعنی حضرت شعیبؑ کی قوم کے لوگ۔ اس قوم کا نام بنی مدیان تھا۔ مدین اُن کے مرکزی شہر کو بھی کہتے تھے اور اُن کے پورے علاقے کو بھی۔ رہا ایک، تو یہ تبوک کا قدیم نام تھا۔ اس لفظ کے لغوی معنی گھنے جنگل کے ہیں۔ آج کل ایک ایک پہاڑی نالے کا نام ہے جو جبل اللوز سے وادی اُفُل میں آ کر گرتا ہے۔

[۴۴] مدین اور اصحاب الایکہ کا علاقہ بھی حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔

أَصْحَابِ الْحَجَرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۵﴾ وَأَتَيْنَهُمُ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا
مُعْرِضِينَ ﴿۸۶﴾ وَكَانُوا يَنْجُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ يُوْتُوا مِنْهَا
فَأَخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْحِحِينَ ﴿۸۷﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا
كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۸﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ
الْجَبِيلِ ﴿۸۹﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ﴿۹۰﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَكَ

حجر^[۸۵] کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں، اپنی نشانیاں اُن کو دکھائیں، مگر وہ سب کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے اُن کو صبح ہوتے آ لیا اور اُن کی کمائی اُن کے کچھ کام نہ آئی^[۸۶]۔ ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے^[۸۷] اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے نبیؐ، تم (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے^[۸۸]۔ ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے

[۳۵] یہ قوم خود کا مرکز کی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تھوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہ راہ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبیؐ کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ اُن کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔“ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف، حاشیہ ۵۷) [۳۶] یعنی اُن کے وہ سنگین مکانات جو انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر بنائے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔ [۳۷] یہ بات نبی ﷺ کی تسکین و تسلی کے لیے فرمائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت بدظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستہ میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آ رہا ہے، اس سے گھبراؤ نہیں۔ یہ ایک عارضی کیفیت ہے، مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے۔ اس لیے کہ زمین و آسمان کا یہ پورا نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر۔ کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ۔ لہذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لیے ہے نہ کہ باطل کے لیے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم، حواشی ۲۵، ۲۶، ۳۵، ۳۶، ۳۷)

[۳۸] یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے، کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے، جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لیے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۵۵﴾ لَا تَمُدَّنَّ
عَيْنِيكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ
عَلَيْهِمْ وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۸﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا
التَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۵۹﴾ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹﴾

رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں،^[۴۹] اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے۔^[۵۰] تم اُس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ اُن کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔^[۵۱] انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ میں تو ”صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں۔“ یہ اُسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے اُن تفرقہ پر دازوں کی طرف بھیجی تھی

ہتھکنڈوں سے یہ تمہاری سعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں اُن کا بھی اسے علم ہے۔ لہذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

[۴۹] یعنی سورہ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو سو آیتیں ہیں، یعنی البقرہ، آل عمران، المائدہ، النساء، الانعام، الاعراف اور یونس، یا انفال و توبہ۔ لیکن سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورہ فاتحہ ہی مراد ہے۔ بلکہ امام بخاری نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی نے سبع من المثنائی سے مراد سورہ فاتحہ بتائی ہے۔

[۵۰] یہ بات بھی نبی اور آپ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب حضور اور آپ کے ساتھی سب کے سب انتہائی خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ کار نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضور کی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور حضرت خدیجہ کا سرمایہ بھی دس بارہ سال کے عرصے میں خرچ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں سے بعض کم سن نوجوان تھے جو گھروں سے نکال دیے گئے تھے، بعض صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے جن کے کاروبار معاشی مقاطعہ کی مسلسل ضرب سے بالکل بیٹھ گئے تھے، اور بعض بیچارے پہلے ہی غلام یا موالی تھے جن کی کوئی معاشی حیثیت نہ تھی۔ اس پر مزید یہ ہے کہ حضور سمیت تمام مسلمان مکہ اور اطراف و نواح کی بستیوں میں انتہائی مظلومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف سے مطعون تھے، ہر جگہ تذلیل و تحقیر اور تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور قلبی و روحانی تکلیفوں کے ساتھ جسمانی اذیتوں سے بھی کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ دوسری طرف سردارانِ قریش دنیا کی نعمتوں سے مالا مال اور ہر طرح کی خوش حالیوں میں مگن تھے۔ ان حالات میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم شکستہ خاطر کیوں ہوتے ہو، تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ رشک کے لائق تمہاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے نہ کہ اُن لوگوں کی مادی دولت جو طرح طرح کے حرام طریقوں سے کمارے ہیں اور طرح طرح کے حرام راستوں میں اس کمائی کو اُڑا رہے ہیں اور آخر کار بالکل مفلس و قلاش ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔

[۵۱] یعنی اُن کے اس حال پر نہ گڑھو کہ اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں، اپنی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں کو اپنی خوبیاں سمجھے بیٹھے ہیں، خود اُس راستے پر جا رہے ہیں اور اپنی ساری قوم کو اس پر لیے جا رہے ہیں جس کا یقینی انجام ہلاکت ہے، اور جو شخص انہیں سلامتی کی راہ دکھا رہا ہے اس کی سعی اصلاح کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیے ڈالتے ہیں۔

الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسَعَلَنَّهُمْ
 زِدًا ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ
 وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٤﴾ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿٩٥﴾
 الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ
 نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
 نَهْيًا ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾

جنہوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔^[۵۲] تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

پس اے نبی، جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں، جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجلاؤ، اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔^[۵۳]

[۵۲] اس گروہ سے مراد یہود ہیں۔ ان کو مُفْتَسِمِينَ اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے دین کو تقسیم کر ڈالا، اس کی بعض باتوں کو مانا، اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی و بیشی کر کے بیسیوں فرقے بنا لیے۔ ان کے ”قرآن“ سے مراد توراہ ہے جو ان کو اسی طرح دی گئی تھی جس طرح اُمت محمدیہ کو قرآن دیا گیا ہے۔ اور اس ”قرآن“ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے سے مراد وہی فعل ہے جسے سورہ بقرہ، آیت ۸۵ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اَفْتَوْا مُنُونًا بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ”کیا تم کتاب اللہ کی بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو؟“ پھر یہ جو فرمایا کہ یہ تنبیہ جو آج تم کو کی جا رہی ہے یہ وہی ہی تنبیہ ہے جیسی تم سے پہلے یہود کو کی جا چکی ہے، تو اس سے مقصود دراصل یہود کے حال سے عبرت دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے غفلت برت کر جو انجام دیکھا ہے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب سوچ لو، کیا تم بھی یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

[۵۳] یعنی تبلیغ حق اور دعوت اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اُس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے۔